Urdu Studies
An international, peer-reviewed,
bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 6 │Issue 1 │Year 2026
Pages: 31-57

اکیسویں صدی کے نسائی ادب میں عورت کے وجود پر مکالمہ

آمنہ تحسین

Abstract. The present paper examines contemporary women's Urdu literature to explore how women writers articulate their consciousness of self, identity, and social position. It argues that this literature transcends the expression of personal experiences to become a critical engagement with the structures of patriarchy, social injustice, and gender inequality. Through themes such as self-awareness, the assertion of rights, love, deprivation, resistance, and political and social concerns at national and global levels, women writers challenge prevailing assumptions about women's lives and identities. The paper foregrounds the significance of this literary expression as a means of understanding women's experiences in both public and private spheres and of examining the social structures that shape them from a feminist perspective.

Keywords. Contemporary Urdu Literature, Women's Writing, Feminist Consciousness, Gender Identity, Patriarchy, Gender Inequality, Women's Resistance, Social Injustice.

تمہید

اکیسویں صدی کے ابھی صرف پچیس برس گزرے ہیں، لیکن ان برسوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے انسانی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ سائنس و ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی، مصنوعی ذہانت، ترسیلی نظام کی وسعت، نت نئی ایجادات اور ڈیجیٹل ذرائع کے فروغ

ISSN: 2583-8784 (Online)
Included in UGC-CARE List since October 2021
Published on October 23, 2026
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/

نے نہ صرف دنیا کے نظام کو تبدیل کیا ہے بلکہ انسانی فکر، طرزِ زندگی اور سماجی تعلقات کو بھی نئی جہتیں عطا کی ہیں۔ ان تبدیلیوں کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ مستقبل میں انسانی زندگی کی ممکنہ صورتوں کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ عالم کاری، انفارمیشن ٹکنالوجی، ڈیجیٹل میڈیا، تعلیم کے بڑھتے ہوئے مواقع اور معاشی سرگرمیوں میں شرکت کے امکانات نے فرد کی سماجی حیثیت، حقوق اور انفرادی شناخت کے بارے میں نئے سوالات پیدا کیے ہیں۔

ان تبدیلیوں کے اثرات خواتین کی زندگی پر بھی نمایاں طور پر مرتب ہوئے ہیں۔ تعلیم نسواں کا فروغ، حقوق نسواں کی تحریکیں، معاشی خود مختاری کے امکانات اور ذرائع ابلاغ تک بڑھتی ہوئی رسائی نے خواتین میں خود آگہی، خود اعتمادی اور اپنے حقوق کے شعور کو تقویت بخشی ہے۔ اس کے نتیجے میں عورت کے اپنے وجود، سماجی مقام اور انفرادی شناخت کے تصور میں تبدیلی آئی ہے۔ آج کی باشعور عورت محض اپنے مسائل اور محرومیوں کے اظہار تک محدود نہیں رہنا چاہتی، بلکہ اپنی صلاحیتوں کے اعتراف، فکری آزادی، سماجی وقار اور مساوی حقوق کی بنیاد پر اپنی شناخت قائم کرنے کی خواہش مند ہے۔ وہ اپنے بارے میں رائج تصورات کو قبول کرنے کے بجائے ان پر سوال اٹھاتی اور اپنی زندگی سے متعلق فیصلوں میں خود مختاری کا مطالبہ کرتی ہے۔

تاہم، جدیدیت اور تکنیکی ترقی کے باوجود خواتین کی صورت حال یکساں نہیں ہے۔ طبقاتی تفاوت، معاشی انحصار، صنفی امتیاز، پدرسری اقدار اور سماجی و ثقافتی پابندیاں آج بھی ان کی آزادی اور ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ ڈیجیٹل ذرائع نے جہاں خواتین کو اظہار خیال اور رابطے کے نئے مواقع فراہم کیے ہیں، وہیں آن لائن ہراسانی، کردار کشی اور نگرانی جیسے مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ اس لیے محض جدید ذرائع تک رسائی کو خواتین کی حقیقی بااختیاری کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا؛ اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ یہ مواقع ان کی عملی آزادی، فیصلہ سازی اور سماجی حیثیت میں کس حد تک تبدیلی لاتے ہیں۔

معاصر خواتین کی اردو شاعری اور نثر کو اسی بدلتے ہوئے سماجی و فکری تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ادب عورت کے داخلی تجربات، شناخت کی جستجو، جسم و ذات کے شعور، محبت،

محرومی، مزاحمت اور پدر سری نظام سے کشمکش کو محض ذاتی احساسات کے طور پر پیش نہیں کرتا، بلکہ ان کے پس پشت کار فرما سماجی، ثقافتی اور سیاسی عوامل کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ خواتین لکھنے والوں کا اپنے تجربات کو زبان دینا دراصل ان تصورات اور اقدار سے مکالمہ ہے جو طویل عرصے سے عورت کی شناخت اور اس کے سماجی کردار کا تعین کرتے رہے ہیں۔ اس اعتبار سے معاصر خواتین کا اردو ادب عورت کی خود آگہی اور انفرادی شناخت کے اظہار کے ساتھ ساتھ صنفی تعلقات اور معاشرتی ساخت کے تنقیدی مطالعے کا بھی اہم وسیلہ ہے۔

آج کی خواتین یہ جاننا چاہتی ہیں کہ مرد اساس معاشرے نے صدیوں سے ان کے وجود کو مسخ کرکے اسے ثانوی حیثیت کیوں دے رکھی ہے؟ کیا بحیثیت انسان معاشرے میں ان کا اپنا کوئی مستقل وجود اور تشخص نہیں؟ کیا ان کی شناخت محض ان کی حیاتیاتی ساخت اور جسمانی وجود تک محدود ہے؟ کیا وہ صرف ماں، بہن، بیوی اور بیٹی جیسے رشتوں کے حوالے سے متعین ہونے والی ایک صنفی شناخت ہیں؟ کیا ان کی سماجی پہچان صرف شادی شدہ، مطلقہ، بیوہ یا معلقہ ہونے کی حیثیت سے قائم ہوتی ہے؟ آخر وہ کون سے سماجی، ثقافتی اور پدر سری عوامل ہیں جو عورت کی انفرادی شناخت کو اس کے رشتوں اور ازدواجی حیثیت کے تابع بنا دیتے ہیں؟ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا عورت بحیثیت ایک مکمل انسان اپنی ذات، اپنی فکر، اپنی خواہشات اور اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ جینے کا حق نہیں رکھتی؟

ایسے کئی سوال ہیں جو عصری نسائی ادب میں مکالمے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اس مکالمے کی کئی جہتیں ہیں جو عورت کے وجود و اور انفرادی شناخت کے متعلق قابل غور وفکر ہیں۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ نسائی ادب محض عورتوں کے لکھے ہوئے ادب کا نام نہیں ہے بلکہ یہ عورت کے شعور، ادراک، شناخت، احساس ذات اور ارزاں سماجی وجود کا ترجمان فکری وادبی سرمایہ ہے۔ اکیسویں صدی میں خواتین کی تحریروں نے عورت کے وجود کے متعلق روایتی سوچ وفکر اور جدید نقطۂ نظر کے درمیان ایک پر زور مکالمہ قائم کیا ہے۔ خواتین قلم کاروں نے نہ صرف اپنی شناخت، احساسات اور تجربات کو قلم بند کیا ہے بلکہ معاشرتی جبر، صنفی امتیاز، گھریلو تشدد، طبقاتی نابرابری اور ثقافتی تضادات جیسے مسائل کو بھی موضوع بنایا اور عورت کے سماجی و معاشی موقف کی پیچیدگیوں کو پیش کرتے ہوئے اس کے وجود

کی ارزانی کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ عالم کاری نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ مختلف ثقافتوں، زبانوں اور نظریات کی ترسیل اور اختلاط نے جہاں دنیا بھر میں تبدیلی لائی ہے وہیں خواتین کی سوچ اور اظہار کو بھی نئی وسعت دی ہے۔ فی زمانہ خواتین قلم کار مقامی مسائل کے ساتھ عالمی مسائل جیسے ماحولیاتی بحران، جنگ، ہجرت اور انسانی حقوق پر بھی خوب قلم اٹھا رہی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم اور معاشی خود مختاری نے بیشتر خواتین میں خود اعتمادی، شعور اور فکری آزادی پیدا کی ہے۔ دوسری طرف انٹرنیٹ اور سوشیل میڈیا نے خواتین کو ادب کی دیگر بستیوں سے ربط اور اظہار فن کے نئے نئے پلیٹ فارم فراہم کیے ہیں۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف ان کا ادبی اظہار عالمی سطح تک پہنچ پا رہا ہے بلکہ انھیں دوسروں کے تجربات زندگی، نئے موضوعات اور اسالیب سے اکتساب حاصل کرنے کے مواقع مل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کی خواتین کا ادب سماج کے تئیں زیادہ تنقیدی شعور کے ساتھ بے باک اظہار کا پیکر نظر آتا ہے۔

اردو کا نسائی ادب اور عورت کے وجود پر مکالمہ

اکیسویں صدی کے عالمی تناظر میں اردو کے نسائی ادب کا جائزہ لیں تو واضح طور پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ خواتین کی لکھی تحریروں کو صرف ان کے اندرون ذات کا سفر یا اظہار ذات کا ذریعہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ ان کے ادب کو گھر آنگن کے مسائل یا ذاتی حقوق کے متعلق احتجاج و مزاحمت کی آواز کے دائرے میں مقید کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کی تحریروں کو فکری انقلاب کی تحریک بالخصوص عورت کے وجود اور اس کی انفرادی شناخت کے مختلف پہلو کا مکالمہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بیشتر ادیباؤں اور شاعرات نے اپنی تحریروں میں جہاں مقامی تاریخ، تہذیب، مذہبی اقدار، ثقافتی جبر اور ذاتی تجربات کو موضوع بنا کر اپنے مطالعے، مشاہدے اور فکر کی بلندی کا ثبوت دیا ہے وہیں سماج میں عورت کے وجود اور بہ حیثیت انسان اس کی شناخت کا مسئلہ زیر بحث لا کر ایک فکری انقلاب کو آواز دی ہے۔ عصری اردو ادب میں عورت اپنی انفرادی شناخت اور با اختیاری کے لیے جدوجہد کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اردو نسائی ادب کی یہ آوازیں بڑی توانا اور بلند آہنگ ہیں، فکر و فہم سے بھرپور ہیں۔ یہ آوازیں قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔

پیش نظر مقالہ ہندوستان کے تناظر میں اردو کے معاصر نسائی ادب کے مطالعے اور تجزیے پر مرکوز ہے۔ اگر چہ کہ اردو کا نسائی ادب اپنی وسعت اور فکر کی پرواز سے اپنے علاقائی حد بندیوں سے آزاد ہو کر بہت وسعت اختیار کر گیا ہے۔ عالمی سطح پر اردو بستیوں میں مقیم خواتین قلم کار جدید موضوعات پر قلم اٹھا رہی ہیں اور حقوق نسواں کے مباحث کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ چونکہ اس مقالے میں "عورت کے وجود پر مکالمے" کو زیر بحث لایا گیا ہے اسی لیے مناسب معلوم ہوا کہ محدود علاقے کو منتخب کیا جائے اور اسی ماحول میں لکھے گئے ادب کو مطالعے اور تجزیے کا حصّہ بنایا جائے تاکہ عورت کے وجود کی نارسائیوں یا اپنی شناخت کے متعلق اس کے شدت اظہار کو اسی سماجی و ثقافتی ماحول کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے جس میں یہ مزاحمتی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں نہ صرف صنفی مساوات کو دستور کا اہم حصّہ بنایا گیا ہے بلکہ تعلیم و ترقی نسواں اور ان کے تحفظ کے متعلق مختلف اقدامات اور قوانین اپنائے گئے۔ باوجود ان تمام تر کوششوں نیز تعلیم و روزگار کے میدان میں عورت کے بڑھتے قدم کے باوجود مختلف سماجی و ثقافتی درجہ بندیوں اور اصول و ضوابط کے ساتھ اس پر جبر و استحصال میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی بے شمار عورتیں صنفی مسائل میں گھری حاشیہ پذیر نظر آتی ہے۔ تعلیم کا فروغ، سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی اور اقتصادی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہندوستانی سماج کے بنیادی ڈھانچے میں کسی حد تک تبدیلی رونما ہوئی ہے، لیکن سماجی سطح پر صدیوں سے چلے آرہے پدر سری روایات یا نظریات اور صنفی تفرقات پر مبنی نظام میں مکمل طور پر تبدیلی واقع نہیں ہو پائی ہے۔ خاندانی اور سماجی سطح پر عورت کے متعلق فرسودہ تصورات اور اس کا "روایتی کردار" آج بھی وہی ہے جو گزرے برسوں میں تھا۔ عصر حاضر میں معاشی حصّہ داری کی ایک اہم رکن ہونے کے باوجود اس کے پسماندہ موقف میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو پائی۔ تعلیم و معاشی ترقی کے باوجود مرد اساس سماج میں اس کا وجود ارزاں اور محکومیت کا شکار ہے۔ صارفیت اور عالم کاری کی ضرورتوں نے اس کے ساتھ استحصال کے نت نئے انداز ڈھونڈ نکالے ہیں۔ اب بازار میں عورت کا صرف جسم ہی فروخت نہیں ہوتا بلکہ اب اس کی "کوکھ" کی بھی قیمت لگنے لگی ہے۔ تحفظ فراہم کرنے والے تمام سماجی ادارے اس کے لیے غیر محفوظ بن کر رہ گئے

ہیں۔ وہ ''آصفہ ہو کہ آروشی یا عائشہ ''اب عورت گویا کہیں محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ عورت کے خلاف ہونے والے جرائم کی بڑھتی تعداد، سال بہ سال گرتا ہوا جنسی تناسب، آنگن سے لے کر چوراہے تک لٹتی عصمتیں اور تعلیم و ترقی کے تمام شعبوں میں مردوں کے مقابلہ میں انتہائی کم شمولیت ایک مہذب سماج کے عدم توازن کو صاف طور پر ظاہر کر رہی ہیں (گورنمنٹ آف انڈیا ۲۰۲۳)۔ ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوششیں یوں تو انیسویں صدی سے شروع ہوئیں لیکن وہ کوششیں آج بھی مکمل طور پر کیوں کامیاب نہیں ہو پائیں۔ اس کی وجوہات ہمیں سمجھنی ہوں گی۔ اس کی بنیادی وجہ صدیوں سے ہندوستان میں رائج وہ پدر سری نظام ہے جو مرد کے غلبہ اور طاقت کا نظام ہے۔ اس نظام نے عورت کو ''کمزور جنس'' قرار دیا اور اسے سماج میں ''ثانوی و محکوم طبقہ'' کا درجہ دے کر بنیادی حقوق سے دور رکھا۔ جس کے اثرات سے سماج ابھی نکل نہیں پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صنفی تفرق، جبر واستحصال کی ایسی سینکڑوں مثالیں ہندوستان کے تقریباً خاندانوں میں دیکھی جاسکتی ہیں (تحسین ۲۰۲۵)۔

اکیسویں صدی کے تناظر میں اردو نسائی ادب کے شعری ونثری سرمایہ کے جائزے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ نسائی ادب میں خواتین کا شعور کئی جہات میں ظاہر ہوا ہے، جیسے ذات کا شعور، شناخت کا شعور، حقوق کا شعور، سماجی ناانصافی کا ادراک، محبت، محرومی اور آزادی کا احساس، معاشرتی جبر کے خلاف مزاحمت نیز عالمی و قومی سطح کے سیاسی اور سماجی مسائل وغیرہ ان کی تحریروں کا حصّہ بنے ہیں ۔ یہ تمام عناصر خواتین کے ادب کو ایک منفرد فکری جہت عطا کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں عصری آگہی، جدید رجحانات، موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ نسائی حسّیت کے مختلف پہلو انتہائی روشن اور واضح خدوخال میں نظر آتے ہیں ۔ بالخصوص اکیسویں صدی کے حوالے سے عورت کے وجود اور اس کے انفرادی تشخص پر مکالمہ نہایت اہمیت کا حامل اس لیے ہے کہ خواتین قلم کاروں کا یہ ادبی رجحان، اور اظہار میں شدت ان کے ادب کو پچھلی صدی کے ادب سے کسی حد تک ممتاز بناتی ہے۔ نسائی ادب کا یہ امتیازی پہلو نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ عورت کا یہی اظہار ذات خود عورت کے وجود سے جڑی پیچیدگیوں نیز اس کے متعلق سماجی نظریات کے علاوہ تانیثی نقطۂ نظر (Feminist standpoint) کو جاننے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ہندوستان میں عورت کے وجود پر "ادبی ڈسکورس" بہت عرصہ قبل شروع ہو چکا۔ یہ کوئی عصر حاضر کی دین نہیں ہے بلکہ برسوں پہلے عورت کے وجود سے جڑے مسائل مختلف زبانوں کے ادب کا حصّہ بنتے رہے ہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی دور کے نسائی ادب میں موضوعات کا وہ تنوع اور بلند آہنگی نہیں تھی جو عصری ادب میں نظر آتی ہے۔ گذرے برسوں کے دوراں مختلف ہندوستانی زبانوں میں منظر عام پر آنے والے نسائی ادب کا سرسری سا جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ خاتون تخلیق کاروں نے عورت کی حیثیت کے متعلق نہ صرف سوال قائم کیے تھے اور بنیادی حقوق کی مانگ کی تھی۔ اس کی آنکھوں کو ڈھیر سارے خواب دیے تھے اور ادب کے آسمان پر اپنی شناخت کے ساتھ ظاہر ہونے کے حوصلے بھی بخشے تھے۔ ابتدائی دور کی چند ہندوستانی خاتون تخلیق کاروں میں ساوتری بائی پھولے (شعری مجموعہ "کاویا پھولے"، ۱۸۵۴ء)، تارا بائی شنڈے (مصنفہ "استری پرش تلنا"، ۱۸۸۲ء)، رقیہ سخاوت حسین (Sultana's Dream 1905) کے علاوہ اردو قلم کار خواتین رشید النسا (ناول "اصلاح النسا"، ۱۸۸۱ء)، محمدی بیگم (مدیر، رسالہ تہذیب نسواں، ۱۸۸۶ء)، صغرا ہمایوں مرزا (ناول "مشیر نسواں"، ۱۹۰۵ء)، زاہدہ خاتون شروانیہ (طویل نظم، آئینہ حرم، ۱۹۲۱ء)، رشید جہاں (افسانہ دلی کی سیر مشمولہ "افسانوی مجموعہ انگارے"، ۱۹۳۱ء)، نذر سجاد حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، وغیرہ وغیرہ کی تحریروں کے علاوہ اور بھی ممتاز خاتون تخلیق کار تھیں جنھوں نے عورت سے جڑے مسائل پر لکھ کر ہندوستانی سماج میں عورت کے وجود کے متعلق ایک ڈسکورس کی شروعات کی تھی۔ پھر بدلتے وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلتے چلتے خواتین کی تعلیم و خود آگہی میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور ان کے ادبی اظہار میں بھی واضح فرق آتا گیا۔ خواتین تخلیق کاروں میں بیشتر نے اپنی تحریروں میں "عورت" کی پست حیثیت کی وجوہ، پدرسری روایات و نظریات، صنفی امتیازات اور سماجی و ثقافتی جبر و استحصال کو اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور پوری شدت سے شعری و نثری ادب میں پیش کیا۔ پیش نظر مقالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ عصر حاضر کے نسائی ادب کی چند شعری و افسانوں کی مثالوں کے حوالے سے عورت کے وجود اور انفرادی شناخت پر مکالمے کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جا سکے۔

اکیسویں صدی کے نسائی ادب میں عورت کے وجود کے متعلق مکالمہ کہیں بیانیہ کی شکل میں نظر آتا ہے تو کہیں راست اور جارحانہ مکالمہ کی صورت بھی اختیار کر گیا ہے۔ اس مکالمہ میں کہیں پدرانہ سماج کے جبر اور استحصالی رشتوں کو عیاں کیا گیا ہے تو کہیں عورت کی زبوں حالی کے مختلف رنگ پیش کیے گئے ہیں اور کہیں شعوری طور پر بیدار ذہن عورت اپنے وجود کے اثبات پر شدت سے اصرار کرتی نظر آتی ہے۔ ایک اور واضح تبدیلی کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے جدید قلم کار خواتین نے نسوانی کرداروں کے روایتی پیکر کو بدل دیا ہے اور انھیں ایک مکمل شخصیت کی حیثیت سے اپنی کہانیوں میں مرکزیت دی ہے ساتھ میں انفرادی سطح پر ان کی اقتصادی، سماجی و ثقافتی مزاحمت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں جس عورت نے قلم تھاما ہے وہ تعلیم یافتہ اور باشعور ہے ”صنفی سیاست“ (Gender politics) کی زیریں لہروں سے خوب واقف ہو گئی ہے اور سماج میں اپنے مقام و مرتبہ کو لے کر شعوری طور پر بیدار بھی ہو گئی ہے۔ ایسی بیدار ذہن عورت کے عکس اردو کے نسائی ادب میں موجود ہیں جنھیں مطالعے میں لانا اس لیے ضروری ہے کہ عورت کے وجود کی یہ وہ شبیہ ہیں جو ایک طرف عدم مساوی سماج کے رویوں کے متاثر فرد کی ترجمانی کرتے ہیں تو دوسری طرف اپنے لیے بنیادی انسانی حقوق اور ایک باوقار زندگی کے لیے احتجاج کرتی عورت کے روپ میں نظر آتے ہیں (تحسین ۲۰۱۹)۔ ایسے ہی سیکڑوں تصویروں سے چند مثالیں یہاں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جس میں معاصر شاعرات کے عورت کے متعلق فکری رویوں اور اسلوب کی انفرادیت کو ذیل کی نظموں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

میں خوف زدہ کبوتری نہیں
کہ جس پر کوئی باز بڑی آسانی سے جھپٹ پڑے
میں وہ سہمی سہمی سی بلّی بھی نہیں
جو گھر کے کچن میں ر دودھ کی پتیلی دیکھ کر میاؤں میاؤں کرتی ہے
میں وہ دبکی ہوئی کتیا بھی نہیں
چند چھیچھڑوں کے عوض

جو اپنے مالک کے تلوے چاٹتی ہے
میرے ماتھے پر کوئی ایسا اشتہار نہ چپکاؤ
میں نے مقدس کتابیں پڑھی ہیں
اور اپنی قیمت جانتی ہوں (کسوٹی جدید ۲۲۵)۔

میں بھی
تمہارا صرف
استعمال کر سکتی ہوں
اور تم بھی
میری طرح
بے وقعت ہو سکتے ہو
جو تم
میری حیثیت کو
نہ سمجھو (عشائی ۳۱) ۔
اڑانیں میری نہ پنکھ میرے ہوا بھی تیری فضا بھی تیری
جو چھن گئے وہ فلک بھی تیرے جو سر ہوئے وہ فراز تیرے
میں خود بھی اپنی کہاں ہوں زد پر ترے اشاروں پہ اڑ رہی ہوں
بے اختیار ہے وصف میرا ہیں سب امتیاز تیرے (پروین ۲۰۱۴)۔

دشنام ملے یا انعام مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا
مجھے تو اپنے آزاد ہاتھوں سے اپنے پیروں کی بیڑیاں ہٹا کر
اس ملگجے اندھیرے کو اپنی پلکوں سے بٹور کر
کنارے لگانا ہے

دروازے تک جانا ہے
کہ ان بند پٹوں سے باہر ایک کھلی فضا
میرا انتظار کر رہی ہے
جہاں میں کم از کم آزادی سے سانس تو لے سکوں گی (ظفیر الحسن ۲۰۰۴)۔

نہ میرے پاؤں کی انگلی انگوٹھے سے بڑی ہے
نہ میرے ہاتھ کی وہ لکیر
کہیں سے بھی کٹی ہوئی ہے
پھر تم کیوں میرے ساتھ نہیں ہو
تم میں اور مجھ میں
یہ انتر کیوں ہے
میں جو کہتی ہوں وہ غلط ہے
تم جو کرتے ہو وہ سچ ہے (رفیع ۲۰۰۴)۔
میں اپنے جسم میں رہتی ہوں اس تکلف سے
کہ جیسے اور کسی دوسرے کے گھر میں ہوں (بانو داراب وفا، مشمولہ، تبسم ۲۰۰)۔

درج بالا شعری سرمایے میں عورت کے وجود پر مکالمے کی مختلف جہات کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو نہ صرف اردو شاعرات کے جدید فکری سرمایہ کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہیں بلکہ عورت کے مکمل وجود کی قبولیت پر زور اور سماج میں انفرادی شناخت کے اصرار کو مختلف زاویوں سے جاننے کی طرف مائل کرتی ہیں۔ عصر حاضر کی یہی وہ بیدار ذہن عورت ہے جو اپنے اطراف و اکناف میں موجود صنفی تصورات پر مبنی روایتوں کو بڑی باریک بینی سے دیکھ رہی ہے اور انھیں اپنی تحریروں میں بحث کا حصّہ بھی بنا رہی ہے۔ اس حوالے سے اگرچہ کہ خواتین کا شعری اظہار زیادہ توانا نظر آتا ہے۔ لیکن فکشن میں بھی اتنی ہی سنجیدہ، موثر اور فکر انگیز تحریریں ہمیں اس موضوع کی اہمیت کی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ گزرے برسوں میں خواتین کا لکھا فکشن اس اعتبار سے

زیادہ اہمیت کا حامل نظر آتا ہے کہ اس میں عالمی و قومی منظر نامے، موضوعات میں تنوع نیز ان کے اسلوب کی جدت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کی کہانیوں اور ناولوں میں عورت کے ارزاں وجود کے جہاں بے شمار عکس ابھر آئے ہیں وہیں ان نثری تحریروں کے حوالے سے عورت کے متعلق مردانہ نقطہ نظر کو بھی خوب زیر بحث لایا گیا ہے۔ فکشن نگار خواتین میں بیشتر نے اپنے افسانوں میں ”کوکھ سے لے کر کفن تک اور گود سے گور تک“ پھیلی ہوئی عورت کے وجود کی نارسائیوں کو پیش کیا اور کشمکش حیات کی مختلف جہات کو زیر بحث لاکر نسائی ادب کو نئی سمت و رفتار عطا کی ہے۔ آگے صفحات پر افسانوں کے حوالے سے ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

عرصہ قبل رقیہ سخاوت حسین نے اپنی کہانی (Sultana's Dream, 1905) کے ذریعے ”بااختیار ہندوستانی عورت“ کے متعلق خواب دیکھا تھا اور مرد اساس معاشرے میں عورت کے محکوم و مظلوم وجود پر غور و فکر کے متعلق نہ صرف بڑے اہم سوال اٹھائے تھے ’بلکہ خواتین کو ان کے وجود کی اہمیت بھی بتائی تھی۔ ان کی آنکھوں کو سماجی تبدیلی کے خواب دیکھنے پر راغب کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ برسوں سے خواتین اس خواب کو اپنی آنکھوں میں بسائے ’انھیں حقیقت میں بدلنے نیز سماج میں اپنے وجود کو منوانے کی سعی پیہم کر رہی ہیں۔ شائستہ فاخری کے افسانے میں اس حقیقت کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

> سلطانہ کے خواب میرے پاس ہیں مگر میں نے ان خوابوں کی چوری نہیں کی۔۔۔
> یہی خواب تو میری ملکیت ہیں، جنھیں حاصل کر کے میں صحیح معنوں میں ”میں“ بن سکی۔ ورنہ میری کیا اہمیت رہتی اس ”میں“ کے بغیر (فاخری ۳۳)۔

فی زمانہ عورت اپنے تشخص کے ساتھ سماج میں باوقار مقام پانے اور اپنی شناخت قائم کرنے کی جانب بڑے اعتماد اور سبک رفتاری سے رواں دواں ہیں لیکن مرد اساس معاشرے میں روزمرہ پیش آنے والے دگرگوں واقعات اور سینکڑوں صنفی مسائل اسے ہر قدم پر روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو لگتا ہے اس کے باوقار وجود کو پانے کی منزل ابھی کافی دور ہے۔ ایسے موقع پر جب وہ پیچھے مڑ کر نسائی فکر و شعور کی تاریخ پر نظر ڈالتی ہے تو سوالات کے دائرے میں خود ہی گھر جاتی ہے۔ ایسے ہی سوالوں کی

بازگشت ہمیں شائستہ فاخری کے ایک اور افسانہ"سنورقیہ باجی"میں کس طرح سنائی دیتی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

> عورت کے وجود کی چیخ و کراہ، اس کی روح کے المیے، اس کے باطن کی ویرانی کو محسوس کرنے والا کون ہے؟سو برس کے بعد بھی ہے کوئی(فاخری ۳۹)؟

ہندوستانی خواتین کے پسماندہ موقف کے تناظر میں شائستہ فاخری کا مذکورہ بالا سوال نہ صرف آج کے سماجی وتہذیبی حالات کا ترجمان ہے بلکہ اس سوال میں کئی صدیوں کی تاریخ کی بازگشت بھی پوشیدہ ہے۔سوالات کی یہ بازگشت اب محدود نہیں رہ گئی ہے بلکہ کئی ایک آوازیں ان سوالوں کی ہم آواز ہوگئی ہیں جن کی گونج کو عصر حاضر کے نسائی ادب میں بھرپور طریقے سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ہندوستان میں عورت کی نارسائیوں کے مختلف رنگ رہے ہیں۔عصر حاضر کے افسانوں کے جائزے میں ان کے مختلف شیڈز دیکھنے کو ملتے ہیں جس سے کہ سماج میں عورت کے ارزاں وجود کی ایک نمایاں تصویر عیاں ہوتی ہے۔دراصل ہندوستانی سماج میں عورت کے وجود سے جڑے مسائل کوکھ سے ہی شروع ہوجاتے ہیں۔بیشتر گھرانوں میں اس کا وجود بہ حیثیت انسان کے جنم لینے کا حق بھی نہیں رکھتا۔اسے کوکھ میں ہی ماردیا جاتا ہے۔لڑکی کے متعلق سماجی نظریات،مادہ جنین یا طفل کشی کی عبرتناک تصویر جیلانی بانو کے افسانے، مثلاً ایک دن لیبر روم میں، Specimen Box اور منظوم افسانہ"دنیا کا پہلا دن"میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔افسانہ"اسپیسی مین باکس"کے یہ مکالمے دیکھیے جو ریسرچ اسکالرز کی زبانی مادہ نطفے کو دیکھ کر ادا ہوئے ہیں۔ان مکالموں کے حوالے سے عورت کے متعلق سماج کے نظریے کو سمجھا جاسکتا ہے۔

> اونہہ۔۔۔وہ بھی کوئی مرد ہے کہ سب کو فکر ہو کہ وہ بھگوان بنے گی یا شیطان؟عورت تو بس عورت ہی رہتی ہے۔
>
> ہاں یار۔۔۔وقت سے پہلے آنکھیں کھول کر دیکھنے والی عورت کو تو ہمیشہ کے لیے Specimen Box میں بند رکھنا چاہیے۔
>
> اس سے کیا ہوگا۔۔۔؟ایک لڑکی نے پوچھا۔

مذہب، قانون اور دنیا کے مردوں کو سکون ملے گا۔ اس کی بات پر سب زور زور سے ہنسنے لگے۔

اس لڑکی کو ریسرچ لیب کیوں بھیج رہے ہیں؟ ایک لڑکا پوچھ رہا تھا۔

دوسرا ہنستے ہوئے کہتا ہے کہ "ماں کے پیٹ سے نکالی ہوئی لڑکیوں کو تو کوڑے میں پھینک دیتے ہیں" (کسوٹی جدید ۱۰۸)۔

مادہ نطفہ "اگر کوکھ میں کسی طرح بچ جاتا ہے اور انسانی وجود کی شکل میں سماج کا حصّہ بنتا ہے تب بھی اس کی زندگی اجیرن ہی ہوتی ہے۔ اس کی سماعتوں پر جو پہلا پتھر پڑتا ہے۔ اس کی جھلک جیلانی بانو کے ہی ایک منظوم افسانہ "دنیا کا پہلا دن" سے یہ اقتباس دیکھیے:

لڑکی ہے؟ لڑکی ہے؟

کیا لڑکی ہے؟ ماں نے گھبرا کے پوچھا۔

ایک شعلہ کی طرح اس آواز نے میرے چاروں طرف آگ لگا دی تھی ۔

ماں نے خون میں ڈوبے ہوئے میرے بدن کو دیکھا۔

لڑکی ہے......؟ میرے ڈیڈی نے گھبرا کے پوچھا۔

لڑکی ہے......میری دادی نے دکھ بھری سانس لے کر پوچھا۔

رو رہی ہے......؟

اب روتی رہے گی (بانو ۶۳)۔

حیاتیاتی شناخت کی بنیاد پر سماج میں مروج یہ تفرقہ دراصل اس پدرسری نظام کی دین ہے جو عورت کو کمزور، مجہول، مفعول اور بے بس سمجھتا آیا ہے۔ ہندوستانی سماج کا بڑا طبقہ لڑکی کو "پرایا دھن" مانتا ہے اور اس بوجھ کو بہر قیمت دوسروں کے حوالے کرنے کی سعی کرتا ہے۔ دوسری طرف شوہر وسسرال والوں کے لیے ساری زندگی وہ باہر سے آئی صرف ایک "پرائی عورت" سمجھی جاتی ہے۔ شادی اور خاندان جیسے سماجی ادارے کے تحت ہر لحہ وہ رشتوں کے پیمانے سے ہی جانچی پرکھی جاتی ہے اور اگر اس پیمانہ پر کھری نہ اترے تو والدین کے گھر واپس بھی لوٹا دی جاتی ہے۔ جب واپس لوٹ جاتی

ہے تو اس کے اپنے گھر والے اسے "ان چاہا بوجھ" سمجھنے لگتے ہیں۔ گویا وہ اپنا ایک "وجود یا شناخت" نہیں رکھتی بلکہ مختلف روایات، نظریات اور رشتوں میں جکڑی ایک "محکوم وجود" ہوتی ہے۔ اس کا وجود کہیں بھی رہے ہمیشہ بے اماں اور ارزاں ہی رہتا ہے۔ نسائی ادب میں خاندانی سطح پر عورت سے جڑے مسائل کے کئی روپ دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں مرد کرداروں کی جانب سے عورت کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ، تشبیہات، استعارات اور مکالمے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ معاشرہ اسے کس نظر سے دیکھتا ہے۔ عورت کے تجربات جب ادب کا حصّہ بنتے ہیں تو یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے عورت کے متعلق مردانہ نقطۂ نظر کیا ہے۔ خاندانی و سماجی نظام میں عورت کے وجود کی زبوں حالی بالخصوص مردوں کی حاکمیت اور ان کی نظر میں عورت کی کمتر حیثیت کی اس دردناک تصویر کو یوں تو بیشتر افسانہ نگار خواتین نے موضوع بنایا لیکن اس کی ایک واضح تصویر ذکیہ مشہدی کے افسانہ "بھیڑیے" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ گھر کی بہو انجو کے متعلق اس کے سسر نند کشور کی زبانی یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے:

> جنانی کی عقل پاؤں میں...... اسے نکال کون رہا ہے۔ بس ذرا مزا چکھانا ہے...... جائے گی کہاں؟ اس کا بھکڑ ماما تو دوسرے دن ہی یہاں لا کر ڈال جائے گا اور برج کی ماں کی بھی مجال نہیں ہے کہ ہماری مرضی کے بغیر بہو کو لے جائے۔ دیکھتی جاو تماشہ... (مشہدی ۱۸۳)۔

مذکورہ بالا اقتباس پدر سری نظام میں مرد کی حاکمیت اور عورت کی محکومیت کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہے۔ دراصل پدر سری نظام طاقت (power) کے ان ہی رشتوں پر مبنی ایسا سلسلہ وار نظام ہے جو نسل در نسل مردوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہی طاقت تمام شعبہ ہائے حیات کو کنٹرول کر تی ہے اور کمزور پر استحصال کے دائروں کو وسیع اور شکنجوں کو مظبوط تر کرتی رہتی ہے۔ اس کنٹرول سسٹم کی مکمل جھلک افسانہ "بھیڑیے" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ نند کشور کی بہو انجو تعلیم حاصل کرنے کی چاہ میں جب اس روایتی پدری نظام سے مخالفت کرنے اور اس سے دور چلے جانے کی کوشش کرتی ہے۔ تب اسے بہت جلد احساس ہو جاتا ہے کہ اس نظام کی جڑیں صرف گھر کے آنگن میں پیوست نہیں ہیں، بلکہ سماج میں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ذکیہ مشہدی نے دراصل یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ

پدرانہ معاشرہ میں عورت کے وجود کی قدر نہ کرنے والے بھیڑیے نما انسان بے شمار ہیں جو صرف خاندانی نظام کا حصّہ بن کر ہی عورت پر ظلم وجبر نہیں کرتے بلکہ وہ مختلف شکلوں میں سماج میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور ہر طرح سے عورت کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی عورت اپنے وجود کے اثبات اور اپنی شناخت بنانے کے لیے زندگی کے سفر پر تنہا نکل پڑتی ہے تو مرد اساس معاشرے میں وہ جن تجربات سے گذرتی ہے انھیں زیر بحث افسانے میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ذیل کی سطور میں ایک اور فکر انگیز تصویر دیکھیے:

> انجو کو ایسا لگا کہ وہ ننگی کھڑی ہے۔ چاندنی میں نہائی ہوئی۔ جسم پر ایک تار نہیں اور قریب کی امرائیوں میں بھوکے بھیڑیوں کا جھنڈ اس کا منتظر ہے۔ بھیڑیے جو طاقت ہیں۔ طاقت جو روپیہ ہے۔ طاقت جو ہتیار ہے۔ طاقت جو ریگستانوں کے کنوؤں میں تیل بن کر بہتی ہے۔ طاقت جو سیاسی بازی گروں کی ٹیڑھی عقل ہے۔ طاقت جو پنچایت کو خرید لینے کی صلاحیت ہے۔ طاقت جو مرد کی جنسی برتری ہے۔ طاقت جو قتل کو خود کشی اور نسل کشی کو فساد کہلوانے کی قدرت رکھتی ہے (مشہدی ۱۸۴)۔

پدر سری نظام کے تحت سماج میں مرد کو حاکم اور عورت کو محکوم رکھنے نیز اس کو صرف حسین پیکر یا جنسی آسودگی کا سامان کے بطور استعمال کرتا رہا۔ جب وہ استعمال کے قابل نہ سمجھی گئی اسے رد کر دیا گیا۔ عورت کے وجود کی اس تراشیدہ پہچان کو نسل در نسل آگے بڑھانے کے لیے سینکڑوں رسوم و رواج، روایات اور نظریات تشکیل دیے گئے۔ یہ تمام عوامل عورت کے وجود کو صدیوں سے مسخ کرتے رہے اور سماج میں اسے بے مایہ و بے شناخت بنا ڈالا۔ مرد اساس سماج نے اس کے وجود کے اندر جاری ٹوٹ پھوٹ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ صنفی تفریق کی اس کرب ناک حقیقت کو رفیعہ شبنم عابدی نے ایک عورت کی نظر سے دیکھا، محسوس کیا اور افسانہ ”فلرٹ گرل“ میں کس طرح سے پیش کیا ہے ملاحظہ کیجیے۔

> یہ زمانہ جسم کی حسین عمارتیں تو دیکھتا ہے، ان عمارتوں کے عارضی رنگ وروغن کی تو داد دیتا ہے مگر ان کے اندر چھپے ہوئے بھیانک کھنڈروں کو کیوں نہیں

دیکھتا؟ وہ کوٹھوں پر رقص کرتی ہوئی حسیناؤں کو دیکھتا ہے، لیکن ان بے شمار بد نصیب لڑکیوں کو نہیں دیکھتا جو کسی روی، کسی پرکاش اور کسی راجیش کے ماں باپ کی لالچ اور ہوس کا شکار ہو کر اپنے خوابوں کو کھو کر بھٹکتی پھر رہی ہیں اور ان زندہ لاشوں پر جھپٹتے ہوئے سفید گد سماج میں عزت اور آبرو سے جی رہے ہیں(عابدی ۲۸۰)۔

ہندوستانی سماج میں عورت اگرچہ کہ اب نہ صرف تعلیم حاصل کر رہی ہے بلکہ مرد کے برابر معاشی حصہ دار بھی بن رہی ہے۔باوجود اس کے سماج میں اس کے ثانوی درجہ کو لے کر سوچ میں کوئی خاص فرق نہیں آپایا ہے۔آج بھی سماج میں اس کے استحصال کے سینکڑوں طریقے رائج ہیں۔بلکہ ظلم وجبر کی کئی جہتیں ہو گئی ہیں۔ان کی جھلکیاں خواتین کے افسانوں میں جا بجا ملتی ہیں۔اس ضمن میں صادقہ نواب سحر کا افسانہ ”ابارشن“بیشتر مردوں کی انانیت اور خود غرضی کے پس پردہ عورت کے جسم اوراس کی جنسیت پر کنٹرول کی کریہہ حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔مذکورہ افسانے میں سرینا اور اس کے شوہر کی زندگی کی ایسی ہی جھلک دکھائی گئی ہے۔سرینا گریجویشن کی طالبہ ہے لیکن ماں باپ اسے شادی کے بندھن میں باندھ دیتے ہیں۔شادی کو چند ماہ ہی ہوئے کہ اس کی کوکھ میں بچے کی آمد کی خوش خبری ملی۔تاہم حمل کی وجہ سے سرینا کی صحت کافی متاثر رہنے لگی۔سرینا کا شوہر چاہتا تھا کہ حمل کی پیچیدگیوں اور صحت کی شدید خرابی کے باوجود وہ کسی بھی صورت میں گریجویشن کا امتحان لکھے اور پاس ہو جائے تا کہ اس کے اپنے آفس میں سرینا کو نوکری دلوائی جاسکے اور اپنی معاشی ذمہ داریوں کے بوجھ کو کم کیا جاسکے۔سرینا اپنی صحت کی سخت خرابی کی وجہ سے اس برس امتحان لکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن شوہر کی زبردستی کی وجہ سے آمادہ ہو جاتی ہے اور بے حد تکلیف کے باوجود امتحان گاہ پہنچ جاتی ہے اور پیپر لکھنے کی کوشش بھی کرتی ہے لیکن شدید خرابی صحت کی بناء پر اس سے یہ بالکل ممکن نہیں ہو پاتا اور وہ امتحان گاہ کے باہر نکل جاتی ہے۔سرینا کا یہ فیصلہ اس کے شوہر کو سخت ناگوار گزرتا ہے۔بدلے میں وہ اسے گھسیٹتے ہوئے ابارشن کروانے کے لیے ہسپتال لے کر چلا جاتا ہے(سحر ۱۲۸-۱۳۳)۔

عورت کی کشمکش حیات کو خواتین فکشن نگاروں نے درون خانہ معاملات کے ذریعے بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ نگار عظیم نے اپنے کئی افسانوں میں عورت و مرد کے رشتے کی پیچیدگیاں اور عورت کے ساتھ دیگر رشتوں کے غلط برتاؤ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل کا بڑا اچھا احاطہ کیا ہے اور دونوں کرداروں کی نفسیات کا تجزیہ بھی بخوبی پیش کیا ہے۔ اس طرح کے تجزیے خواتین سے جڑے بہت سارے درون خانہ مسائل اور خاندانی نظام میں عورت کے بے مایہ وجود کو سمجھنے میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے تحریر کردہ افسانے، مرد، زرد پتےّ، بھوک، بیاہ، مردار، ابورشن، ایکویریم، احساس زیاں وغیرہ سے چند مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان افسانوں میں رشتوں کے درمیاں عورت کے مٹتے وجود کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ذیل میں دیے جارہے اقتباسات میں عورت کی خود کلامی کی جھلکیاں دیکھیے اور اس کے بین السطور میں چھپے عورت کے درد و کرب کو محسوس کیجیے:

> میں یہاں بے مصرف سی چیزوں کی طرح کب تک پڑی رہوں (عظیم ۶۱)۔
>
> میرا وجود اس کلے (مٹّی) کی مانند ہو گیا تھا جسے بچے بار بار گوندھ کر مختلف شکلیں بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں (عظیم ۷۱)۔

ہندوستانی سماج میں صدیوں سے چلی آرہی روایات کے تحت خاندانی نظام کا ایک مخصوص ڈھانچہ بن گیا ہے جس میں عورت انسان نہیں بلکہ محض ایک ایسی لچک دار شئے بن کر رہ گئی ہے جو رشتوں کی خواہش و مرضی کے مطابق خود کو مختلف اشکال میں ڈھالتی رہتی ہے۔ حسب ضرورت وہ شئے اہمیت کی حامل بنادی جاتی ہے اور پھر کسی وقت غیر اہم سامان کی طرح حاشیہ پر کردی جاتی ہے۔ قمر جہاں نے افسانہ ''یادوں کی پروائیاں'' میں خاندانی نظام میں عورت کو دی گئی اسی دوہری حیثیت پر بڑا' طنزیہ سوال اٹھایا ہے۔ وہ لکھتی ہیں: کیا آج بھی ہم عورتوں کا وجود اپنے گھر کے لیے ایک اہم پرزے کی حیثیت رکھتا ہے (جہاں ۲۶۱)؟

افشاں ملک نے اپنے افسانوں میں عورت کے مختلف روپ پیش کیے۔ کہیں وہ مسائل میں گھری مجبور و بے بس معلوم ہوتی ہے تو کہیں وہ فرسودہ روایتوں سے انحراف کرتی بھی نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایک کہانی ''میں'' انتہائی موثر کہانی ہے جس میں نادرہ کا کردار عورت کے وجود سے جڑی ایسی

پیچیدگیوں کی پرتوں کو کھولتا ہے جو نسوانیت کے لیے تراشی گئی اہم خصوصیات کے پیچھے اکثر دب جاتی ہیں۔نادرہ کے حوالے سے انھوں نے بیوہ عورت کی نفسیاتی الجھنوں اور دیگر نجی مسائل کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔مذکورہ افسانہ کا ایک جملہ عورت و مرد کی نجی زندگی کی نفسیات کے بڑے گہرے فرق بلکہ ایک بیوہ کی سسکتی زندگی اور اس کے احساسات کو واضح کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:مرد اپنا بستر بڑی آسانی سے بدل لیتا ہے لیکن عورت کو کسی دوسرے بستر کو اپنانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے (ملک ۱۰۹)۔

عصر حاضر کی خواتین کے افسانوں میں جہاں سماج کی پسماندہ عورت کی تصویر ابھرتی ہے وہیں سماج کے روایتی صنفی تصورات سے انکار کی واضح جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔پچھلی چند دہائیوں میں تحریر شدہ افسانوں کا جائزہ لیں تو ان میں صرف گھریلو امور میں الجھتی، جلتی، کڑھتی عورت کے کردار ہی نظر نہیں آتے بلکہ تعلیم یافتہ، باشعور، خود اعتمادی سے آراستہ ایسے کردار ملتے ہیں جو پدری سماج کے متعصبانہ رویوں کے خلاف مزاحمت اور مباحثہ کے لیے پوری طرح تیار نظر آتے ہیں۔ان کرداروں کے تجزیے سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کردار دراصل ان خود آگاہ خواتین کی نمائندگی کر رہے ہیں جو سماج میں اپنے وجود کی اہمیت کو سمجھ گئے ہیں اور اپنی مکمل شناخت کے ساتھ وہ سماج کا حصّہ بننا چاہتے ہیں۔فی زمانہ گھر اور کام کو لے کر ان کی جدوجہد کی کئی تصویریں عصری نسائی ادب کا حصّہ ہیں۔ترنم ریاض کے افسانے، ’’تعبیر‘‘میں ایک ایسی جدوجہد کرتی لڑکی کا کردار پیش کیا گیا ہے جو شہر کے ایک قانون داں کی جانب سے روا رکھے گئے ظلم واستحصال کے آگے مجبور ہو کر کسی کمزور لمحے میں یہ فیصلہ ضرور کرتی ہے کہ وہ اپنی نوکری چھوڑ دے گی لیکن اسے جلد ہی سماج میں اپنے وجود کی اہمیت کا احساس ہو جاتا ہے کہ وہ ایک مجبور و بے بس فرد کی طرح حالات کے آگے جلد ہی شکست خوردہ ہو کر خود سپردگی اختیار نہیں کرے گی بلکہ پدری معاشرے کے پروردہ افراد کے خلاف اپنے پورے تشخص کے ساتھ اعلان جنگ کرے گی۔ پھر وہ فیصلہ کرتی ہے:’’وہ بزدلوں کی طرح میدان نہیں چھوڑے گی۔ چاہے کتنا بھی وقت لگے وہ لڑے گی۔ اپنی پاکیزگی کو ڈھال بنا کر وہ جنگ خود لڑے گی۔۔۔ اور پھر اس نے استعفیٰ پھاڑ دیا‘‘(ریاض ۸۵)۔

ترنم ریاض کے دیگر افسانے ، دھندلے آئینے ، ناخدا ، ساحلوں کے اس پار ، اور میر ارخت سفر ، کے نسوانی کردار عصر حاضر کے سماج کی ایسی عورت کی نمائندگی کرتے ہیں جو باشعور اور خود دار ہے۔ جو درون خانہ اور بیرون خانہ پیش آنے والے صنفی مسائل سے نپٹنا خوب جانتی ہے بلکہ سماج میں عورت اپنے وجود کے متعلق مروجّہ روایتی تصورات و نظریات کو بدلنے کی سعی بھی بڑی ہی آسانی سے کر جاتی ہے۔ جیسے سماج میں یہ روایت عام ہے کہ لڑکی کو شادی کے بعد اپنی تعلیم ، کیریر یا اپنے تمام خوابوں کو چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ وہ مکمل طور پر شوہر اور سسرالی رشتوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ درون خانہ تمام تر ذمہ داریاں فرض بنا کر اس کے نام کر دی جاتی ہیں۔ جب کہ مرد کی زندگی میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں آتی وہ ہمیشہ آزاد رہتا ہے۔ اگر عورت اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کچھ کرنا چاہتی ہے اپنے حالات بہتر بنانا چاہتی ہے تو مرد کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ جیسے افسانہ "ناخدا" سے یہ اقتباس دیکھیے:

> آپ یہ چاہتی ہیں کہ ہم گھر میں بچے کھلائیں اور آپ باہر جائیں۔ یہ سب بھول جایئے اب۔ یا تو شادی کرنی تھی یا پھر کیریر بنانا تھا۔ اب دو دو کام تو ہونے سے رہے (ریاض ۱۰۴)۔

تاہم آج عورت نے یہ جان لیا ہے کہ اسے محکومیت کے دائرے سے کس طرح باہر آنا ہے اور وہ خاندان و روزگار دونوں میں توازن کیسے برقرار رکھنا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے ہم سفر کو گھریلو ذمہ داریوں کا شریک بنانے اور اسے احساس کروانے کی جرأت بھی کر لیتی ہے۔ جیسے اسی افسانہ سے یہ اقتباس بھی دیکھیے: آج مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ اس لیے آج آپ گھر پر رہیے۔ پہلے میں ہو آتی ہوں (۱۰۶)۔

غزال ضیغم کے افسانوں میں عورت کا وجود بڑے مضبوط قوت ارادی کا مالک نظر آتا ہے۔ نہ صرف وہ روشن خیال، تعلیم یافتہ اور باشعور ہے بلکہ اپنے تشخص اور فیصلہ سازی کے حق سے بخوبی واقف ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

> میں آپ کی زمین کا قطعہ نہیں ہوں کہ جس کو چاہے آپ دے دیجیے۔ اکیس سال کی لڑکی ہوں۔ قانونی حق ہے میرے پاس بالغ ہونے کا (زریں ۲۲۳)۔

غزال ضیغم نے اپنے افسانے "مدھوبن میں رادھیکا" کے ذریعہ سماج کے اس صنفی تصور کو بھی توڑنے کی کوشش کی ہے جس میں صدیوں سے عورت کے وجود کو جکڑ دیا گیا ہے۔ ممتا کو نسوانیت کی معراج بنا دیا گیا اور اسی جذبہ کو بنیاد بنا کر اولاد کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری، ایثار، قربانی، صبر جیسی خصوصیات کا لزوم ماں پر عائد کر دیا گیا اور باپ کی حیثیت سے مرد ان تمام تر ذمہ داریوں سے آزاد ہو گیا۔ جب کبھی کسی ناگزیر وجہہ سے شوہر اور بیوی کے رشتہ میں علیحدگی کا معاملہ آپڑتا ہے تب عورت کو ہی بچوں کی ذمہ داری سنبھالنی پڑتی ہے اور مرد دوبارہ شادی کے لیے پوری طرح پھر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عورت اولاد کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے بے شمار مسائل میں گھر جاتی ہے اور اس کا اپنا وجود اور تشخص پوری طرح ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ غزال ضیغم نے اپنے افسانوں کے ذریعے اس روایتی تصور کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانہ "مدھوبن میں رادھیکا" کے ایک نسوانی کردار سائمہ کا یہ روپ ملاحظہ کیجیے۔

> ساجد کے گود میں دونوں ننھے منوں کو ڈالکر سائمہ نے کہا کہ:
> اب میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں ان دونوں معصوموں کو تم سنبھالو نہیں تو قیامت کے دن حشر کے میدان میں تمہارا دامن تھاموں گی (۲۲۶)۔

غزال ضیغم کے زیر بحث افسانے میں سائمہ کا یہ رد عمل ممکن ہو قاری کو غیر فطری و ناپسندیدہ لگے۔ اس لیے کہ قاری بھی اسی مرد اساس معاشرے کا پروردہ ہے جس میں عورت کے وجود کو صرف ماں اور ممتا کے حوالے سے اہمیت دی گئی اور نسوانیت کے نام پر مخصوص سماجی رول، نیکی، بھلائی، شرم و حیا، ایثار و قربانی اور بے شمار فرائض کی چادر میں اسے لپیٹ کر اس کے تشخص کو کہیں دبا دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں اسے ایک مکمل انسانی وجود کی حیثیت سے قبول کرنے نیز اس کے حقوق اور مقام و مرتبہ دینے کی ضرورت پیش آئی وہاں وہ خالی داماں ہی رکھی گئی۔ لہٰذا یہ نظریہ عام طور پر بنا رہا کہ "عورت ماں کا روپ ہوتی ہے اور اس کی ممتا ہر رشتہ میں موجود ہونا لازم ہے۔"۔ خود عورت نے بھی اپنے اسی تصور کو اپنا لیا اور نسل در نسل اس تصور کو پہنچانے میں اپنا اہم رول بھی ادا کرتی رہی

ہے۔ تاہم آج کے دور میں اس تصور میں کسی حد تک تبدیلی آئی ہے جس کی ترجمان سائمہ ہے جو اب اتنی باشعور اور باہمت ہو گئی ہے کہ اپنے ہم سفر کو اس کی ذمہ داریاں بتانے کا حوصلہ بھی کرنے لگی ہے۔ سائمہ کا یہ ردعمل دراصل "مرد غالب خاندانی نظام" سے انحراف اور "صنفی مساوات" کو عام کرنے کی ایک کوشش قرار دی جاسکتی ہے۔ افسانہ نگار دراصل اس اہم فریضہ کی طرف توجہ دلانا چاہتی ہیں کہ "اولاد" کو دنیا میں لانے کے جب عورت و مرد دونوں ذمہ دار ہیں تو ان کی پرورش و پرداخت کے لیے بھی دونوں یعنی ماں اور باپ برابر کے ذمہ دار ہیں۔

ثروت خاں نے اپنے افسانوں میں عورت کے وجود سے وابستہ بے شمار مسائل کو مختلف زاویوں سے موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں موجودہ عہد کی باشعور و بااختیار عورت کی تصویر صاف جھلکتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت اپنے وجود کی اہمیت سے خوب واقف ہے۔ اسے اپنی سوچ و فکر اور صلاحیتوں کا پورا احساس ہے۔ وہ روایتی سماج کے پیدا کردہ پیچیدگیوں سے مقابلہ کرنے نیز اپنے وجود کو منوانے کے لیے پوری طرح تیار نظر آتی ہے۔ افسانہ "میں مرد مار بھلی" میں ایک ایسا روایتی نسوانی کردار پڑھنے کو ملتا ہے جو مرد اساس معاشرہ کا پروردہ ہے۔ ماں نے اس کی پرورش کے دوران ہر لمحہ اسے یہی سمجھایا تھا کہ مرد کے ظلم و ستم اور استحصال کو سہنا عورت کے لیے ضروری ہے کیونکہ وہی اس کا نصیب ہوتا ہے جبکہ اسی کردار کی ذہنی تبدیلی کو بھی موصوفہ نے موضوع بنا کر سماج کو ایک اہم پیغام دیا ہے کہ بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ عورت کو خود آگہی ملتی گئی اور وہ باشعور ہوتی چلی گئی ہے۔ لہٰذا اس کی فکر میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ عورت اب اپنے وجود کے گرد پڑی وہ تمام سماجی روایات و نظریات کی زنجیروں کو توڑنا چاہتی ہے جو اس کو محکوم و مجبور بناتے ہیں۔ مذکورہ کہانی کی کردار بھی آخر کار یہ طے کر لےتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی پسماندہ زندگی گزارنے نہیں دے گی جیسی وہ آج تک گزارتی آئی ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی بیٹی کو ایک ایسی باشعور اور باہمت عورت بنا دے گی جو مرد کی جانب سے کیے جانے والے ظلم و استحصال کو عورت کا مقدر سمجھ کر سہتی نہ رہے بلکہ ہر طرح کی ناانصافیوں اور امتیازات کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔ جیسا کہ وہ اپنی بیٹی کو نصیحت کر جاتی ہے:

بیٹی تجھے ایک دن بڑا افسر بننا ہے۔ سماج کے ان "جوان مردوں" سے کمزوروں، بے بسوں اور لاچاروں کو نجات دلانا ہے۔ ایک بہادر عورت بن کر ناانصافی کے خلاف لڑنا ہے(خان ۱۴)۔

ہندوستانی سماج کی یہ تصویر بھی ہم سب پر عیاں ہے کہ جہاں ہمیں "عورت" کے استحصال کی کئی ایک صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں وہیں عورت دیوی یا ماں کے روپ میں صدیوں کی تاریخ وثقافت کا حصّہ نظر آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صدیوں کی اسی تاریخ کے دوران عورت کے لیے "نسوانیت" کو بنیاد بنا کر کئی لازم صفات تشکیل دی گئیں اور ان ہی صفات کی حامل عورت عظیم، پاکباز، نیک عورت سمجھی گئی۔ نسوانیت کے یہ تشکیل شدہ صفات ہندوستانی سماج میں عرصہ دراز سے رائج ہیں۔ خود عورت نے بھی ان تمام خصوصیات کو اپنے لیے لازم جانا اور اپنی لڑکی کی پرورش کے لیے بھی ضروری سمجھا اور سماجیانہ کے عمل کے دوران ان خصوصیات کو وہ نسل در نسل بخوبی منتقل بھی کرتی رہی۔ لیکن زیر بحث افسانے میں مردمار بھلی میں عورت کے وجود کی خود شناسی میں اس رجحان کی تبدیلی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آج کے تناظر میں ماں باشعور ہوگئی ہے۔ اب وہ اپنی لڑکی کو صرف زنانہ پن یا نسوانیت کی صفات سے آراستہ تو کرتی ہے لیکن اسے ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور خود اعتماد فرد کی حیثیت سے بھی سماج میں شناخت دلانے کے لیے بھی کوشاں نظر آرہی ہے۔ ثروت خاں کے دیگر افسانے، زندگی اور موت، مردانگی، حسن کا معیار، وغیرہ میں عورت کے وجود کو مختلف زاویوں سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں اس عورت کی تصویر نہیں جھلکتی جو اپنا کوئی وجود یا نظریہ حیات نہیں رکھتی اور نہ وہ کل کی "سیتا" نظر آتی ہے جس کی شخصیت کو ہندوستانی سماج نے اپنی مرضی کے مطابق تشکیل دیا تھا، بلکہ وہ آج کی یعنی، اکیسویں صدی کی، سیتا کے کردار میں پیش ہوتی ہے۔ جس کے باشعور وجود کو خود اس نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ صدیوں کے تجربات کے تناظر میں آج کی سیتا کو خود سیتا نے ہی تشکیل دیا ہے۔ اب اس کا وجود صرف حسین جسم سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس نے اپنے حسن کا معیار خود طے کیا ہے۔ جیسے افسانہ "ترشنا" سے یہ قابل غور سطور دیکھیے:

اب حسن نے اپنی عقلیت، اپنی خود اعتمادی، اپنی قوت ارادی اور اپنی قابلیت سے اس نئی دنیا میں اپنی پہچان قائم کی ہے......نئے پیمانے مرتب کیے ہیں۔ نئی نظر

پیدا کی ہے۔ حسن کی تنقید کے اصول متعین کیے ہیں...... آج اس نے نئے شعور و آگہی سے کام لینا سیکھا ہے۔ نئی بلندیوں کو چھوا ہے (خان ۱۱۶)۔

ہندوستانی سماج میں "اردھانگنی" کا نظریہ بھی عام ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ صرف ایک مذہب کے متن کا حصّہ ہے لیکن تمام معاشروں میں یہ عام طور پر رائج ہے۔ عورت باپ، بھائی، شوہر یا بیٹے کے نام اور تحفظ کی محتاج ہوتی ہے۔ تنہا عورت گویا جبر و استحصال کا آسان ذریعہ تصور کی جاتی ہے۔ صدیوں سے چلے آرہے ان فرسودہ نظریات کی زنجیروں میں جکڑ کر خود عورت کے ایک بڑے طبقہ کی سائیکی بھی مکمل تبدیل ہو چکی ہے۔ عرصہ تک عورت نے خود بھی اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ اس کا اپنا کوئی الگ وجود یا اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہے بلکہ وہ کئی سماجی رشتوں کی پہچان یا مرد کی زندگی کا حصّہ ہے۔ اس ضمن میں قمر جمالی کے افسانوں سے کئی مثالیں لی جا سکتی ہیں۔ ان کے افسانے لائف لائن، خواب آنکھیں تعبیر، کنکھجورا، وغیرہ میں عورت کا باشعور و بااختیار کردار نظر آتا ہے جو عورت کے وجود کے متعلق فرسودہ نظریات کو نہ صرف توڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے بلکہ اپنے تشخص کے متعلق سماج سے سوال کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ افسانہ "خط کشیدہ" کے یہ مکالمے ملاحظہ کیجیے:

> کیا کیا ہے تم لوگوں نے میرے ساتھ؟ جو چاہے روپ دے دیا۔ چاہے جس نام سے جہاں چاہا کھڑا کر دیا۔ چاہے رنڈی بازار میں، کبھی سیتا، کبھی ساوتری، کبھی دھنیا، کبھی لاجونتی، جب چاہا، جہاں چاہا، جیسے چاہا، کبھی محلوں میں، کبھی فٹ پاتھ پر، کبھی دیوی، کبھی دیوزاد، چڑیل، بھوتنی...... کیوں کہ...... یہی میرا مقدر ہے۔ قربانی میرا مسلک، ایثار میرا شعار اور اوروں کے درد کو اپنے سینے میں چھپا لینا میرا منصب۔ تم بھی اپنی پیش روؤں کی طرح وہی کروگی۔ کہیں بٹھا دوگی لے جا کر۔ کسی کے نام کے ساتھ جوڑ دوگی جیسے میں خود کچھ نہیں۔ فقط کسی کی پسلی کا ٹوٹا ہوا حصّہ۔ کسی کے نام کا آدھا بقایا حصّہ۔ کسی کی شخصیت کی تکمیل کی وجہ۔
>
> کمزور و ناتواں، کم فہم و کم عقل، نہ دل میرا نہ دماغ، نہ جذبات، نہ فیصلے میرے۔ مگر اب نہیں بہت ہو چکا اب میں کسی کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ خود کسی کی شناخت کی وجہ بنوں گی (جمالی ۹۷)۔

اکیسویں صدی میں اردو کے نسائی ادب نے کئی نئی جہتیں اختیار کی ہیں۔ نثر و نظم کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ عورت کے ذاتی تجربات کو سماجی تناظر میں پیش کیا جا رہا ہے۔ زبان اور اسلوب میں جرات اور حقیقت نگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ متوسط طبقے یا حاشیائی حیثیت کی عورتوں کے گھریلو و سماجی مسائل کو پیش کرنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ نسائی ادب کی ان نئی جہتوں کے نتیجے میں حقوق نسواں کے مباحث کی جانب سماج کی توجہ مبذول ہو رہی ہے۔ الغرض اکیسویں صدی کے تناظر میں اردو کے نسائی ادب کے مختصر سے جائزے سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ فی زمانہ ادب میں عورت کے وجود پر مکالمے کے کئی نئے زاویے سامنے آئے ہیں۔ جن کے حوالے سے جہاں ایک طرف سماج کی پیچیدگیوں اور صنفی امتیازات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے تو دوسری طرف عورت کے وجود نیز سماج میں ان کی انفرادی شناخت پر خواتین کے شروع کردہ ڈسکورس کے تنوع کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ قلم کار خواتین کا یہ مکالمہ و مباحثہ اور یہ اعتماد بھری آوازیں نہ صرف عورت کے مکمل وجود کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہیں بلکہ اس کے تشخص کو مستحکم کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں خود خواتین کے طبقے میں ذہنی تبدیلی کا حصّہ بھی بن رہی ہیں۔

پچھلے صفحات پر زیر بحث لائے گئے نثر و نظم کی مثالوں کے تنقیدی تجزیے سے ہندوستانی سماج میں عورت کے متعلق رائج صنفی تصورات اور نظریات کی مختلف نوعتیں سامنے آئیں' جس کے اثرات سے عورت کا وجود متاثر ہوتا ہے اور وہ اپنی انفرادی شناخت نہیں بنا پاتی۔ ان تحریروں سے سماج میں رائج صنفی سیاست کے مختلف زاویوں کو نہ صرف سمجھنے کا موقع فراہم ہو رہا ہے بلکہ پدر سری سماج میں عورت کی پست حیثیت کے اسباب اور اس کے نجی کرب، اور صنفی مسائل سے بھی قاری کما حقہ متعارف ہو رہا ہے۔ عصری نسائی ادب میں جاری اس مکالمے کے جائزے سے ایک طرف سماج کے دوہرے معیار اور نقطۂ نظر کو سمجھا جا سکا تو دوسری طرف عورت کے وجود اور اس کی شناخت کی اہمیت نیز بااختیاری کے متعلق خود خواتین تخلیق کاروں کے نقطہ نظر کو بھی سمجھنے کا موقع فراہم ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں تیز رفتار ٹکنالوجی اور ترسیلی نظام کی بے پناہ ترقی کے نتیجے میں جہاں عورت سے جڑے مسائل میں اضافہ ہوا ہے وہیں عورت کی خود آگہی بھی فروغ پائی ہے۔ فی زمانہ عورت اپنے

مسائل پر بات کرنے، ان کے حل تلاش کرنے اور اپنے حقوق کے ساتھ سماج میں بھرپور شراکت داری کے ساتھ شناخت بنانے کو شاں نظر آتی ہے۔ نسوانی کرداروں کو نئی سوچ وفکر کے ساتھ ادب میں پیش کرنے کے نتیجے میں انسانی حقوق کے دائرے میں وسعت ہو رہی ہے۔ حاشیائی یا پسماندہ طبقات کی عورت بھی اس دائرے میں شامل ہو رہی ہے۔ اس کی ترقی کے متعلق نئے نئے مباحث سامنے آرہے ہیں۔ نسائی ادب میں عورت کے وجود کا یہ مکالمہ عام افراد کے لیے بھی غور وفکر کا حصّہ بن رہا ہے۔ نسائی ادب کے ان امتیازی پہلوؤں کو تانیثیت، مغربیت، جانبداریت کے مختلف عنوانات دے کر نظر انداز کرنے کے بجائے انسانی حقوق اور اہم سماجی ڈسکورس کے طور پر سمجھنا ناگزیر ہے کیونکہ یہ صرف تانیثی مکالمے نہیں ہیں جو کسی مغربی تحریک کا نتیجہ کہہ کر رد کر دیے جائیں بلکہ عورت کا اپنے گم شدہ وجود کا اثبات ہے اور اپنی انفرادی شناخت پر اصرار ہے۔ اپنے وجود کی اہمیت کے متعلق آگہی، عرفان ذات، اپنے حقوق کا احساس اور استحصال کے خلاف خود اعتمادی سے بھرے اس ادبی اظہار کو کشادہ ذہنی سے سمجھنے اور قبول کرنے کی ضرورت ہے۔

اختتامیہ

مجموعی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ معاصر نسائی ادب عورت کی انفرادی شناخت، صنفی مساوات اور سماجی انصاف کے مطالبے کے ذریعے صدیوں سے قائم پدر سری نظام کو چیلنج کرتا ہے۔ اکیسویں صدی کی سماجی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیوں کے تناظر میں یہ ادب عورت کی محرومیوں کے بیان سے آگے بڑھ کر اس کی خود آگہی، فکری خود مختاری اور شناخت کی بازیافت کا وسیلہ بن گیا ہے۔

اردو کی معاصر خواتین ادیباؤں اور شاعرات نے تاریخ، تہذیب، مذہبی اقدار اور ثقافتی پابندیوں سے وابستہ تجربات کو تخلیقی اظہار میں ڈھال کر عورت کے وجود سے متعلق مروجہ تصورات پر سوال اٹھائے ہیں۔ ان کی تحریریں عورت کو محض جسمانی وجود، ازدواجی حیثیت یا خاندانی رشتوں سے متعین کرنے کے بجائے ایک مستقل انسانی وجود اور صاحب فکر فرد کے طور پر تسلیم کرنے پر زور دیتی ہیں۔

پیش نظر مقالے میں نظم و نثر کی منتخب مثالوں کے ذریعے "نسائی ادب میں عورت کی شناخت کے مکالمے" کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شناخت ایک متحرک عمل ہے، جس کی تشکیل میں ذاتی تجربات کے ساتھ طبقاتی، مذہبی، لسانی، ثقافتی اور معاشی عوامل بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نتیجتاً، معاصر نسائی ادب عورت کو محض مظلوم کردار کے بجائے اپنے وجود کا شعور رکھنے والی، سوال اٹھانے اور اپنی شناخت کی تشکیل نو کرنے والی شخصیت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کی بنیادی معنویت عورت کے انفرادی وقار اور مساوی حقوق کی وکالت کے ساتھ اس فکری امکان میں مضمر ہے کہ وہ مروجہ سماجی اقدار پر نظر ثانی اور ایک زیادہ منصفانہ معاشرے کی تشکیل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ لہذا معاصر ادب میں عورت رشتوں کے حوالے سے پہچانے جانے والی ایک فرد سے آگے بڑھ کر ایک خود مختار فرد نظر آتی ہے اور وہ یوں کہتی ہے:

بنت حواہوں میں، عورت ہے مرا اسم شریف
ہے یہ پہچان مری اور یہی ہے تعریف
بنت حواہوں حنابات بڑی ہے میری
نام عورت ہے مرا ذات بڑی ہے میری (حنا رضوی)

مراجع:

بانو، جیلانی۔ بات پھولوں کی۔ نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ ۲۰۰۱۔
تبسم، کہکشاں۔ نسائی شعری آفاق۔ دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ ۲۰۱۵۔
تحسین، آمنہ۔ صنف کی تفہیم۔ سنٹر برائے آن لائن و فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد۔ ۲۰۲۵۔
ـــــ۔ سماج اور صنفی تصورات۔ نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس۔ ۲۰۱۹۔
تریاق (رفیعہ شبنم عابدی نمبر)۔ ممبئی: اردو فاونڈیشن۔ ۲۰۱۷۔
جمالی، قمر۔ صحرا ابکف۔ نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ ۲۰۱۵۔

جہاں، قمر۔"یادوں کی پروائیاں"۔کسوٹی جدید (نسائی ادب نمبر)۔پٹنہ۔۲۰۱۴۔

خان، ثروت۔ذروں کی حرارت۔ٹونک: انیس کتاب گھر۔۲۰۰۴۔

رفیع، اشرف۔پھر سے جینا ہوگا۔حیدرآباد: مکتبہ شعر و حکمت۔۲۰۰۴۔

ریاض، ترنم۔یہ تنگ زمین۔نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔مشہدی، ذکیہ۔منتخب افسانے۔نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔۲۰۱۶۔

زرین، صالحہ۔جدید خواتین افسانہ نگار: نظریہ اور تجزیہ۔الہ آباد۔۲۰۰۹۔

سحر، صادقہ نواب۔خلش بے نام سی۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔۲۰۱۳۔

ظفیر الحسن، بلقیس۔شعلوں کے درمیاں۔دہلی: معیار پبلیکیشنز۔۲۰۰۴۔

عشائی، شبنم۔من میں جمی برف۔نئی دہلی: عرشیہ پبلیکیشنز۔۲۰۱۳۔

عظیم، نگار۔عمارت۔دہلی۔۲۰۱۰۔

فاخری، شائستہ۔اداس لمحوں کی خود کلامی۔الہ آباد: پہچان پبلیکیشنز۔۲۰۱۱۔

کسوٹی جدید (نسائی ادب نمبر)۔پٹنہ۔۲۰۱۴۔

گورنمنٹ اوف انڈیا۔ویمن اینڈ مین ین انڈیا رپورٹ۔منسٹری آف اسٹیٹس ٹکس اینڈ پروگرام امپلی منٹے شنز۔۲۰۲۳۔

ملک، افشاں۔اضطراب۔نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔۲۰۱۷۔

Prof. Ameena Tahseen is associated with the Department of Women's Studies at Maulana Azad National Urdu University (MANUU), Hyderabad. Her areas of interest include gender and society, feminist criticism, women's literature, women's empowerment, and the contributions of Muslim women.

At MANUU, she has served as Associate Dean of the School of Arts and Social Sciences, Head of the Department of Women's Studies, and Director of the Centre for Women's Studies. Her academic, literary, and social contributions to women's advancement have earned her numerous honours and awards.